"اصول فلسفہ وروش رئالیسم"- چند صفحات کا مطالعہ (1)

Study of a few Pages from: "The Principals of Philosophy and The Methodology of Realism" (1)

Open Access Journal
Qtly. Noor-e-Marfat
eISSN: 2710-3463
pISSN: 2221-1659
www.nooremarfat.com
Note: All Copy Rights are Preserved.

Dr. Abou Hadi
Director Noor Research & Development Pvt (Ltd.); Islamabad.
E-mail: Noor.marfat@gmail.com

Abstract:

Knowledge is sacred in itself. And the reason for its sanctity is the efforts of man to achieve it, which have not been done to achieve anything else in the history of mankind. Also, the sanctity of knowledge is associated with its soundness and reliability. This is the reason that the more accurate, correct and reliable the knowledge, the more holy it will be. Ustad Muthari claims that there is a special feature in Islamic philosophy that it proceeds on the basis of evidence and does not settle for anything less than belief. This characteristic of Islamic philosophy has given it special importance and sanctity

In this article, after explaining the importance and sanctity of knowledge and Islamic philosophy from the point of view of Professor Murtaza Mutahari, the subject of Islamic philosophy and these 6 great questions that are sought to be answered in Islamic philosophy have been introduced. In this context, Professor Murtaza Mutahari has described the history of philosophy and the history of philosophy in the world of Islam and has introduced Hikmat al-Mutaaliyyah (Transcendent Theosophy) with a characteristic.

However, he has emphasized that Muslim intellectuals should introduce Islamic philosophy to the people of the world and not rely on Orientalists in this regard; Because in the understanding of Islamic philosophy, as well as in its introduction, the Orientalists have made gross mistakes. In the eyes of Professor Mutahari, the introduction of Islamic philosophy is also important because it has a clear superiority over European philosophy.
In this article, the views of Professor Murtaza Mutahari on the above mentioned points are best interpreted. Of course, this article will be a source of knowledge for the lord of knowledge and wisdom.

Key words: Philosophy, wisdom, principle, approach, realism, Muhammad Hussain, Tabatabai, Murtaza, Mutahari.

خلاصہ

پیشِ نظر مقالہ استاد مرتضی مطہری کے تشریحی نوٹس سے مزین، علامہ طباطبائی کی کتاب "اصول فلسفہ و روش رئالیسم" کے چند صفحات کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ یہ مقالہ فلسفہ کے طالب علموں کے لیے اِس کتاب کے مندرجات کی سادہ و سلیس زبان میں تشریحات پیش کرتا ہے۔ اِس مقالے میں جو مطالب بیان کیے گئے ہیں اُن میں سب سے پہلا مطلب علم کی اہمیت اور اُس کے تقدّس کا بیان ہے۔ مقالہ ہٰذا میں یہ بتایا گیا ہے کہ علم کا تقدس، اُس کی صحت اور یقین آوری سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم جتنا صائب، صحیح اور یقین آور ہوگا، اتنا مقدس ہوگا۔
اس مقالہ میں دوسرا مطلب اِس مدعا پر مشتمل ہے کہ اسلامی فلسفہ میں یہ خاص خصوصیت پائی جاتی ہے کہ یہ برہان کی بنیاد پر آگے بڑھتا اور یقین سے کم تر پر قانع نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسلامی فلسفے کی اسی خصوصیت نے اسے ایک خاص اہمیت اور تقدس عطا کیا ہے۔
اِن مطالب کے علاوہ، پیشِ نظر مقالہ میں اسلامی فلسفہ کے موضوع اور اُن 6 عمدہ سوالات کا تعارف کروایا گیا ہے جن کے جواب کے حصول کی تگ و دَو، اسلامی فلسفہ کی روح رواں ہے۔ اس ضمن میں فلسفہ کی تاریخ اور عالم اسلام میں فلسفہ کی سرگذشت بیان کی گئی ہے اور خصوصیت کے ساتھ حکمت متعالیہ یا ملاصدرائی فلسفے کا تعارف کروایا گیا ہے۔ یہ مقالہ مسلمان دانشوروں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ اہل دنیا کو اسلامی فلسفہ کا کماحقہ تعارف کروائیں اور اس

حوالے سے مستشرقین پر بھروسہ نہ کریں؛ کیونکہ مستشرقین اسلامی فلسفہ کے فہم اور اُس کے تعارف میں فاحش غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ نیز اسلامی فلسفے کا تعارف اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ یہ یورپی فلسفہ پر واضح برتری رکھتا ہے۔

پیش نظر مقالہ میں مذکورہ بالا موضوعات پر استاد مرتضی مطہری کے خیالات کی بہترین ترجمانی کی گئی ہے۔ یقینا یہ مقالہ اربابِ علم و دانش کے لیے معرفت افزائی کا موجب بنے گا۔

کلیدی کلمات: فلسفہ، حکمت، اصول، روش، ریالزم، محمد حسین، طباطبائی، مرتضی، مطہری۔

تعارف

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا سب سے بڑا فرض علم کا حصول اور اُس کا سب سے بڑا شرف، عالم ہونا ہے۔ لیکن مختلف علوم کی باہمی نسبتوں کو دیکھا جائے تو اُن میں سب سے زیادہ صاحبِ فضیلت علم، وہ ہو گا جس کا موضوع دیگر علوم کے موضوعات پر فضیلت اور برتری رکھتا ہو گا۔ اب چونکہ عالمِ وجود و ہستی کا برترین جوہر ''ذات قدسی'' ہے، اُس کی شناخت اور معرفت سب سے بافضیلت علم و معرفت ہے۔ اِس سے حکمتِ الٰہی یا اسلامی فلسفے کی اہمیت و فضیلت کا ادراک حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ حکمتِ الٰہی اور اسلامی فلسفے کا موضوع، وجود کی شناخت ہے اور حکمتِ الٰہی تب تک وجود کے کسی امکانی مرتبے کا اثبات نہیں کرتی جب تک کہ عالمِ امکان سے پہلے وجود کے وجوبی مرتبے یعنی خداوند تعالی کے وجود کا اثبات نہ کرلے تو اِس وجہ سے اسلامی فلسفے اور حکمتِ الٰہیہ کا شمار بافضیلت ترین علوم میں سے ہوتا ہے۔ اسلامی فلسفے اور حکمتِ الٰہیہ کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ یہ تفکر کے بنیادی منبع یعنی عقل سے استفادہ کے ساتھ ساتھ قرآن و سنّت جیسے اُن منابع سے بھی مستقیم و غیر مستقیم استفادہ کرتا ہے جو وجودِ حق کی شناخت میں رہنما کردار ادا کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ فلسفے کا علم جتنا بافضیلت ہے، اتنا اس کی مخالفت بھی شدید ہے۔ متکلم ہو یا فقیہ، عوام ہوں یا خواص، کم و بیش سب طبقات نے فلسفی طرزِ تفکر کی بلاجواز مخالفت کی ہے؛ لیکن فلسفے کو سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا، ابلیس کے اُن خاص چیلوں کی طرف سے ہے جو قدیم و جدید سفسطے، شکّاکیت اور الحاد کو بنامِ فلسفہ رونقِ بازار بناتے رہے ہیں۔ دراصل، سفسطہ، شکاکیت اور مادہ پرستی کی فکری بنیادوں پر استوار الحادی تحریک کا واحد ہدف، انسان سے یقینی معرفت کا دُرِّ گراں چھین کر، اُس کے وجود کے جوہرِ برین، یعنی عقل کو ناکارہ بنانا اور معرفت کے اعتبار (Validity) کو خدشہ دار بنا کر بنی نوع بشر سے ''خدا پرستی'' کو توہم پرستی اور معرفت و شہود کو وہم و گمان قرار دینا ہے۔

جن الٰہی فلسفیوں نے مخالفتوں، تہمتوں، مشکلوں اور محرومیت کے طوفان سے ٹکرا کر بھی حق و حقیقت کے طالبین کے لئے فکر و فلسفے کی سبیل لگائی اور طالبانِ حقیقت کو عرفانِ حق کی شراب سے سیراب کیا اور توحیدی تصوّرِ کائنات کو عقلی استدلال کی بنیانِ مرصوص فراہم کی ہے، اُن میں علامہ سید محمد حسین طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ اور استاد شہید مرتضٰی مطہری رحمۃ اللہ علیہ کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ علامہ طباطبائی کی عظیم تصنیف "اصول فلسفہ و روش رئالیسم" پر استاد مرتضی مطہری کے گرانقدر حواشی اور تشریحی نوٹس، جہاں قدیم و جدید سفسطے اور شکّاکیت کی دلدل میں پھنسی انسانیّت کے لئے یقینی معرفت کی اساس فراہم کرتے ہیں، وہاں انسانی علم کو اوہام اور فکری خطاؤں سے جدا کرکے یہ عروج عطا کرتے ہیں کہ وہ بامِ عرش تک پرواز کر سکیں۔ پیش نظر مقالہ میں "اصول فلسفہ وروش رئالیسم" کی پہلی جلد کے مقدمہ میں استاد مطہری کے پیش کردہ اہم نکات کا اجمالی بیان پیش کیا گیا ہے؛ اس امید پر کہ یہ سلسلہ مزید آگے بڑھے گا۔ و من اللہ التوفیق۔

1. علم کی قدر و قیمت

کتاب "اصول فلسفہ وروش رئالیسم" کی پہلی جلد کے مقدمہ میں استاد مرتضی مطہری نے پہلا نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ انسان کے تمام مقدسات میں سے تنہا "علم و دانش" ہی وہ مقدّس چیز ہے جس کے تقدّس پر ہر نسل اور ہر مکتب و مسلک کے پیروکاروں کا اتفاق ہے اور سب لوگ علم کی رفعت، عظمت اور پاکیزگی کے قائل ہیں؛ یہاں تک کہ نادان سے نادان ترین شخص بھی "علم و دانش" کا احترام کرتا ہے اور کوئی دیوانہ بھی علم و دانش کی محض اس بنیاد پر کہ یہ علم و دانش ہے، تحقیر نہیں کرتا۔

علم و دانش کی محبوبیّت اور اس کا احترام، فقط اس لیے نہیں ہے کہ علم انسان کے لیے زندگی گذارنے کا بہترین وسیلہ ہے اور زندگی کی جنگ میں اسے طاقت و قدرت عطا کرتا ہے اور عالم طبیعت پر تسلط اور حکمرانی عطا کرتا ہے۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا؛ بلکہ اکثر جو صاحبانِ علم محروم رہتے ہیں۔ علم کی تاریخ رنج و غم، محرومی، مصیبت اور مشکلات کی تاریخ ہے۔ اگر علم محض طبیعت پر حکمرانی اور مزے لوٹنے کے لئے مطلوب ہوتا تو علماء اور دانشور یہ سب رنج والم برداشت نہ کرتے اور نہ اپنی زندگیاں اجیرن بناتے۔ استاد مرتضی مطہری کے مطابق، علماء اور دانشوروں کی محرومیت کی تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ علم مادی آسائشات کے حصول کی خاطر محبوب نہیں، بلکہ:

> "علم کا انسانی روح کے ساتھ پیوند، اُن پَست اور حقیر تعلقات سے بالاتر ہے جن کا پہلی نظر میں تصور کیا جاسکتا ہے۔"[1]

علم کے تقدس کے باب میں استاد مطہری نے یہاں دوسرا اہم نکتہ یہ بیان فرمایا ہے کہ علم جتنا یقینی تر، شک و تردید

اور جہالت کی دیواروں کو مسمار کرنے والا، جس قدر کلی، عمومی اور جہالت کے دبیز پردوں کو ہٹانے والا ہو، اُس کی اہمیت اور طلب بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ علم جو برہان کی بنیاد پر استوار اور یقین کی صفت سے موصوف ہو اس کی قدر و قیمت ہر علم سے زیادہ ہے۔ اسلامی فلسفہ اپنی ماہیت میں یقین طلب اور روش میں برہانی ہونے کے ناطے اسلامی علوم میں ایک عظیم اور بالا قدر و قیمت کا حامل علم ہے۔

2. فلسفے کا موضوع

کتاب "اصول فلسفہ و روش رئالیسم" کی پہلی جلد کے مقدمہ میں استاد مرتضی مطہری کا کہنا یہ ہے کہ انسان جن مجہولات تک دستیابی کی آرزو رکھتا ہے، اُن میں سے کچھ کا تعلق عالم ہستی کے کلی نظام، کائنات کی عمومی حرکت، عالمِ وجود کے رمز اور سرائے عالم کے راز کشف کرنے سے ہے۔ لہٰذا یہ مجہولات، انسان کے درجۂ اوّل کے مسائل شمار ہوتے ہیں۔ انسان کامیاب ہو یا ناکام، یہ نہیں ہو سکتا کہ عالم ہستی کے آغاز و انجام، اس کی غرض و غایت، اس کے حدوث و قدم اور وحدت و کثرت، اس کے متناہی یا لامتناہی ہونے، اس کے علّت یا معلول ہونے، اس کے واجب یا ممکن ہونے اور اس طرح کے کئی دیگر سوالات کے بارے میں تأمل سے پہلو تہی کر لے۔

دراصل، ایک عقل مند مخلوق ہونے کے ناطے، بنی نوع انسان کے چند اساسی سوالات ایسے ہیں جن کا فلسفی جواب ہی اُسے قانع کر سکتا ہے۔ فلسفے اور دیگر علوم کا ایک اساسی فرق یہی ہے کہ دیگر علوم، عالمِ ہستی کے پیکر کے کسی ایک حصے، بخرے اور ٹکڑے کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن فلسفہ عالمِ ہستی کی پوری تصویر (Universe As a Whole) کا مطالعہ کرتا ہے۔ در نتیجہ انسان کے درج ذیل سوالات فلسفی سوالات ہیں کہ:

1. عالم ہستی کا آغاز کب سے ہوا ہو گا؟ اس کا انجام کب ہو گا؟ (آغاز و انجام)
2. آیا یہ پورا عالم، پہلے نہ تھا اور بعد میں وجود میں آیا (حُدُوْثْ) یا ایسا نہیں بلکہ عالم ہستی ازل سے ہے۔ اِس کے لیے کوئی نقطۂ آغاز (Starting Point) معین نہیں کیا جا سکتا (قِدَمْ) اور یہ ہمیشہ سے ہے؟
3. آیا یہ عالم ایک اکائی (One Unit) ہے یا مختلف اکائیوں کے مجموعے کا نام ہے؟
4. آیا یہ محدود (متناہی) ہے یا لامحدود (نامتناہی)؟
5. آیا عالم ہستی کی یہ بساط، کسی ہدف اور مقصد کے تحت بچھائی گئی ہے یا یہ ایک بے ہدف کھیل ہے؟ (غرض و غایت)۔
6. آیا یہ عالم ہستی، وجود پانے میں کسی سبب (Cause) کا محتاج ہے (معلوم ہے اور ممکن)؟ یا نہیں، اِسے وجود پانے کے لیے کسی بیرونی سبب کی ضرورت نہیں ہے اور اِس کے وجود میں آنے کا سبب، خود اِس کے اپنے

اندر پوشیدہ ہے (علّت ہے اور واجب ہے)؟

ان سوالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفے کا موضوع ہمہ عالم اور پوری دنیا ہے۔

یہاں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ عالمِ ہستی سے مربوط اِن سوالات کا جواب قرآن و سنت میں موجود ہے اور "ہمہ عالم" قرآن و سنّت کا موضوع ہے۔ لیکن جواب یہ ہے کہ Universe As a Whole کے بارے میں یہ نصوص، درحقیقت، عقل کو قانع کرنے کے لیے اور انسان کی فلسفی فکری طلب پوری کرنے کے لیے نازل اور وارد ہوئی ہیں اور اِن کا نزول یا صدور فلسفے کے موضوع کو فلسفے سے نہیں چھینتا۔ خلاصہ یہ کہ بقول مطہری:

"فلسفہ، پورے عالم کو انسانی فکر کی جولانگاہ قرار دیتا ہے اور انسانی عقل و فکر کو اپنے پَر و بال پر بٹھا کر اُن عوالم کی طرف لے اڑاتا ہے کہ جن کی سیر انسان کی سب سے بڑی آرزو اور منزلِ شوق ہے۔"[2]

3. انسانی تفکر کی تاریخ، فلسفے کی تاریخ

یہاں مرتضی مطہری نے ایک اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ:

"فلسفے کی تاریخ، انسانی تفکر کی تاریخ کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی خاص صدی، کسی خاص زمانے، کسی خاص علاقے یا کسی خاص مقام کو فلسفے کی جنم بھومی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ انسان نے جب بھی اور جہاں بھی تامل کی فرصت پائی تو اس نے اپنی فطری تقاضے کے تحت عالم ہستی کے کلی نظام کے بارے میں رائے قائم کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ اور جہاں تک تاریخ کی ترجمانی کا تعلق ہے تو مصر، ایران، ہندوستان، چین اور یونان جیسے دنیا کے کئی خطوں میں بڑے بڑے فلسفی اور مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے اہم فلسفی مکاتب کی داغ بیل ڈالی۔"[3]

استاد مطہری کے مطابق آج ہمارے پاس اُن اَدوار کے چند فلسفی آثار باقی ہیں جو ہم سے بہت دُور نہیں ہیں لیکن زیادہ قدیم ایّام کے فلسفی آثار میں سب سے زیادہ اور سب سے بہتر، اُس عظیم علمی اور فلسفی تحریک کے آثار باقی ہیں جو تقریبا دو ہزار چھ سو سال پہلے یونان میں شروع ہوئی۔ ان آثار کی بقاء کا سبب یہ ہے کہ اس زمانے سے لے کر آج تک، کوئی ایسا تاریخی خلاء وجود میں نہیں آیا جس کی وجہ سے یہ آثار مکمل طور پر نابود ہو جاتے۔ وہ فکری تحریک جو یونان اور ایشیائے صغیر کے بعض علاقوں سے اٹھی، اسکندریہ میں پھیلی اور جب اسکندریہ اور آتن کا علمی مرکز کلی طور پر نابود ہو رہا تھا اور مشرقی روم کا بادشاہ، "ژوستی نن" ۵۲۹ عیسوی میں اسکندریہ اور آتن کی یونی ورسٹیوں اور مدارس کے دروازے بند کرنے کا حکم صادر کر رہا تھا، دانش مند حضرات خوف و ہراس کے مارے چھپ رہے تھے اور تعلیم و تربیت کے مراکز ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے، عین اُسی وقت، دنیا کے ایک اور خطے پر، اسلام کے سورج کے

طلوع سے ایک نئی علمی تحریک کا آغاز ہوااور ایک جدید اور مضبوط تمدّن کے مقدمات فراہم ہو گئے۔

4. عالمِ اسلام میں فلسفہ

استاد مطہری مدعی ہیں کہ اسلام کے عظیم الشأن پیشوااور دین کے عظیم اولیأ نے علم و دانش اور طالب علم کے مقام و منزلت کی جو حوصلہ افزائی اور تشویق فرمائی، اس کے سبب بنی نوع بشر کے دلوں میں علم کی نئی طلب اور تڑپ بیدار ہوئی جس کے نتیجے میں ایک وسیع اور عظیم اسلامی تمدن معرض وجود میں آیا۔ علوم کے مختلف شعبے تدوین پائے، مختلف زبانوں اور سب سے زیادہ یونانی زبان سے کتابیں ترجمہ ہونے لگیں۔ مدرسوں اور یونی ورسٹیوں کی از سر نو تأسیس ہوئی، لائبریریاں قائم ہوئیں اور اس عظیم اسلامی مملکت کے بڑے بڑے شہر، علوم کا گہوارہ اور طلب علم کی خاطر گھروں سے نکلنے والے تشنگانِ علم کی آمد و رفت کا مرکز بن گئے۔

موجودہ یورپ اور دنیا کے تمام خطّوں سے علم کی تلاش میں نکلنے والے، اسلامی ممالک کی طرف بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ کئی صدیوں بعد یورپ میں جدید انقلاب رونما ہوااور عالمِ علم و دانش میں ایک مثالی تبدیلی وجود میں آئی۔ استاد مطہری کے مطابق تاریخی لحاظ سے جو بات مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ قدیم یونان بھی اپنی معلومات کے اصلی سرمائے میں عالم مشرق کا مقروض ہے اور وہاں کے بڑے بڑے دانش مندوں نے عالم مشرق کا سفر کیا اور یہاں کے دانش مندوں کے نظریات سے فیضیاب ہوئے اور واپس وطن لوٹ کر انہوں نے ان نظریات کو شائع کیا۔

مطہری رقمطراز ہیں کہ:

> "جو موضوع کتابِ حاضر کے ساتھ نسبتاً زیادہ مربوط ہے اور اس کے علاوہ اُس پر کمتر بحث ہوئی ہے، وہ اسلامی فلسفے کی 350 سالہ تاریخی روئیداد کا تعارف ہے کہ بد قسمتی سے جس کا کماحقہ تعارف آج تک نہیں کروایا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ نے کہ جو عام طور پر اس میدان میں یورپی ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کا عادی ہے، اسلامی فلسفہ پر وہ توجہ نہیں دی جو اسے دینا چاہیے تھی۔"[4]

5. حکمت متعالیہ

استاد مطہری کی نظر میں اہل دنیا کے سامنے اسلامی فلسفے کا بالعموم اور "حکمت متعالیہ" کا بالخصوص تعارف پیش کرنا بہت ضروری ہے۔ دراصل، "حکمت متعالیہ" کے نام سے موسوم اسلامی فلسفی نظام کی بنیاد، گیارہویں صدی ہجری میں "صَدْرُ الْمُتَاَلِّہِیْن شیرازی"، معروف بہ "ملّا صدرا" کے ذریعے رکھی گئی۔ ایران میں اغلب فلسفی تعلیمات کا محور اِسی دانش مند کی مہم فلسفی مسائل پر تحقیقات رہی ہیں جو کہ زیادہ تر فلسفۂ اولیٰ اور حکمتِ الٰہی میں

ہیں۔ ملّا صدرا کی فلسفی شخصیت اور آثار کے بارے میں مرتضی مطہری لکھتے ہیں کہ:

"ملّا صدرا نے یونانی فلاسفرز سے یوں تو بالعموم اور افلاطون اور ارسطو سے بالخصوص علمی ورثہ پایا۔ انہوں نے فارابی، ابن سینا، شیخ اشراق اور دیگر عظیم مسلمان حکماً کی یونانی فلسفہ پر شروحات اور اضافات سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔ نیز بزرگ مسلمان عرفاء نے اپنے ذوقِ ہدایت اور قوتِ عرفان سے جو کچھ کسب کیا تھا، ملّا صدرا نے اُسے بھی خوب سمجھا اور پھر از سرِ نو فلسفے کی ایک نئی عمارت کی بنیاد ڈالی اور اسے محکم اور غیر متزلزل اصول و قواعد پر استوار کیا اور استدلال و برہان کے لحاظ سے فلسفی مسائل کو ریاضی کے قواعد کی وہ حیثیت دی کہ بعض کا بعض سے استخراج کیا جاسکے۔ یوں ملّا صدرا نے فلسفہ کو اپنے طریق استدلال میں انتشار اور پراکندگی سے نجات دلائی۔"[5]

اپنے استاد افلاطون کے نظریات کے خلاف قیام کرنے والے ارسطو کے زمانے سے لے کر ملّا صدرا تک، مسلسل یہ دو فلسفی مکتب ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلے آرہے تھے کہ جن میں سے ایک کا نمائندہ ارسطو اور دوسرے کا نمائندہ افلاطون تھا۔ ان دونوں مکاتب کے پیروکار بھی ہر زمانے میں پائے گئے۔ مسلمانوں کے درمیان بھی یہ دونوں مکتب، مکتبِ اشراق اور مکتبِ مشأ کے نام سے معروف ہوئے، خواہ یونان و اسکندریہ ہوں یا عالم اسلام، یا قرون وسطیٰ کا یورپ، ہر جگہ دو ہزار سال تک اِن دونوں مکاتب کے درمیان چپقلش اور فلسفی کھینچا تانی چلتی رہی۔ لیکن صدر المتألہین نے فلسفے کی جو جدید عمارت کھڑی کی، اُس میں انہوں نے ان دو ہزار سالہ تنازعات کو ایسا خاتمہ بخشا کہ اب اشراق اور مشأ کے مکتب کا ایک دوسرے کے مدّمقابل ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور صدر المتألہین کے بعد جو فلسفی بھی آیا اور اس کے فلسفے سے آشنا ہوا، اُس نے اِن دو ہزار سالہ تنازعات کو خاتمہ یافتہ پایا۔

اِس حقیقت سے قطعِ نظر کہ صدر المتألہین کے فلسفے میں ابتکاری اور بے سابقہ جہات پائی جاتی ہیں، یہ فلسفہ اُن عظیم محققین کی آٹھ سو سالہ زحمتوں کا ثمر ہے جن میں سے ہر محقق کا فلسفے کی پیشرفت میں ایک خاص سہم ہے۔ افسوس اس بات پر ہے کہ اس عظیم پیشرفت کے باوجود، جیسا کہ بعض مستشرقین نے گواہی دی ہے، اس فلسفہ کے جنم پر چار صدیاں گذر جانے کے باوجود بھی یورپ میں ابھی تک اس فلسفے کا ایک صحیح اجمالی تعارف پیش نہیں کیا گیا۔

6. اسلامی فلسفہ کے تعارف میں مستشرقین کی لغزشیں

"اصول فلسفہ و روش رئالیسم" کی پہلی جلد کے مقدمہ میں استاد مرتضی مطہری نے اس بات پر خصوصی تاکید کی ہے کہ کو خود مسلمانوں کو اسلامی فلسفے کا اہل یورپ کو تعارف کروانا چاہیے۔ کیونکہ جس طرح مستشرقین نے دیگر اسلامی علوم اور تعلیمات کے اہل یورپ کو تعارف کروانے میں غلطیاں کی ہیں، اسی طرح اسلامی فلسفے کا تعارف

کروانے میں بھی اُن سے اہم خطائیں سرزد ہوئی ہیں۔ شہید مطہری لکھتے ہیں:

"معروف برطانوی مستشرق، پروفیسر ایڈوارڈ براؤن (متوفی ۱۳۰۴ھ، ش) جس نے اپنی عمر ایران اور تاریخ ایران کے مطالعہ میں صرف کی ہے "ادبیات ایران" کی چوتھی جلد میں لکھتا ہے: ایران میں ملّا صدرا کے فلسفہ کی شہرت اور اس کے رائج ہونے کے باوجود، میں نے یورپی زبانوں میں اس کے فلسفی مسلک کے بارے میں فقط دو سطحی اور ناقص خلاصے دیکھے ہیں۔

اسی طرح Kont Gobineau نے ملّا صدرا کے عقائد کے بارے میں چند صفحات لکھے ہیں؛ لیکن ایسا لگتا ہے کہ اُس کی تمام تر معلومات، ایران میں اس کے اساتذہ کی زبان سے سنی سنائی ہیں، وہ بھی ایسے اساتذہ جو خود بھی ملا صدرا کے عقائد کے بارے میں گویا مکمل آگاہی نہ رکھتے تھے۔ Gobineau نے ملّا صدرا کے بارے میں جو شرح حال لکھی ہے وہ اس کے اختتام پر لکھتا ہے کہ ملّا صدرا کی حقیقی روش سو فیصد ابو علی سینا سے مأخوذ ہے۔ حالانکہ صاحبِ "روضات الجنّات" ملّا صدرا کے بارے میں لکھتا ہے کہ:" کان... منقحا اساس الاشراق بما لا مزید علیه و مفتحا ابواب الفضیحة علی الطریقة المشاء و الرواق"۔[یعنی: ملّا صدرا نے اشراقی فلسفہ کی اساس کو اتنا مضبوط بنایا جس سے زیادہ مضبوط بنانا ممکن نہ تھا اور اُس نے مشاء اور رواق کی روش کی رسوائی کے کئی ابواب کھولے۔]

ملّا صدرا کے مکتب کے بارے میں مختصر لیکن سنجیدہ اور صحیح تر تبصرہ وہ ہے جو شیخ محمد اقبال (علّامہ محمد اقبال) نے لکھا ہے۔"[6]

ایڈوارڈ براؤن مذکورہ کتاب میں لکھتا ہے:

"ملّا صدرا کی مشہور ترین کتابیں، اسفار اربعہ اور شواہد الربوبیہ ہیں۔" اور حاشیہ میں رقم طراز ہے کہ: "کونٹ گوبینیو "اسفار" کا معنی سمجھنے میں غلطی کا مرتکب ہوا ہے۔ اُس نے "اسفار" کو جو کہ "سِفر" کی جمع اور "کتاب" کے معنوں میں ہے، "سفر" (مسافرت) کی جمع قرار دیا ہے۔"

استاد مطہری کا کہنا ہے کہ باوجود اِس کے کہ ایڈوارڈ براؤن مستشرقین سے نالاں ہیں کہ انہوں نے ملا صدرا کے فلسفے کا درست تعارف نہیں کروایا، وہ خود ایسے اشتباہات کا مرتکب ہوا ہے۔ خود براون اپنی کتاب "وسطی ایشیا کے مذاہب اور فلسفے" کے صفحہ ۸۱ پر لکھتا ہے:

"ملّا صدرا نے مسافرت (سفر نامہ) کے بارے میں چند دیگر کتب بھی لکھی ہیں۔"

استاد مطہری کا کہنا ہے کہ:

جہاں تک پاکستانی علامہ اقبال کی اُس کتاب کا تعلق ہے کہ جو انہوں نے کیمبرج یونی ورسٹی میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں انگریزی زبان میں تحریر کی، تو وہ ہمیں نہیں مل سکی؛ لیکن اتنا قطعی ہے کہ یہ ایک انتہائی مختصر سا کتابچہ ہے۔ اور جہاں تک ان دو افراد (کونٹ گوبینیو اور ایڈورڈ براؤن) کا تعلق ہے تو یہ دونوں بڑے مستشرق شمار ہوتے ہیں۔ محقق دانش مند، مرحوم محمد خان قزوینی جو خود تقریباً تیس سال تک یورپ کے مختلف کتاب خانوں میں مشغولِ مطالعہ رہے ہیں اور ان کا کئی مستشرقین کے ساتھ قریب کا صمیمی رابطہ بھی رہا ہے، اپنے اُس مقالہ میں جو انہوں نے براؤن کی وفات کی مناسبت سے برلین سے چھپنے والے فارسی مجلے "ایرانشہر" میں شائع کیا، لکھتے ہیں:

"ان کی ادبیات کے بارے میں یورپ اور امریکا کے مستشرقین میں سے کسی نے بھی براؤن کی سی زحمت نہیں اٹھائی اور نہ ہی کسی کو اس جتنی ایرانی ادبیات، ذوقیات، معنویات، حکمأ و عرفأ کے افکار اور اس مملکت کے ارباب مذاہب سے خالص اور دل کی گہرائیوں سے صمیمانہ محبت رہی۔"[7]

اسی مقالہ میں وہ Kont Gobineau کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ فرانس کا مشہور مصنف ہے جس نے فلسفہ، سوشیالوجی، مذہب، اور تاریخ وغیرہ کے باب میں کئی کتابیں تألیف کی ہیں اور فلسفۂ تاریخ کے باب میں اس کا "گوبین ازم" کے نام سے اپنا ایک مخصوص طریقۂ بحث ہے جس کے جرمنی میں بہت زیادہ پیروکار پائے جاتے ہیں۔ یہ شخص 1271ھ.ش سے 1274ھ.ش تک تہران میں فرانس کے سفارتخانہ میں سفیر کا نائب اوّل رہا ہے اور 1278ھ.ش سے 1280ھ.ش تک اسی شہر میں اسی ملک کا وزیر رہا ہے۔"[8]

شہید مطہری مستشرقین کی اسلامی فلسفہ کے تعارف میں لغزشوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان دو بڑے مستشرقین میں سے ایک ملّا صدرا کو مشائی مکتب کا پیروکار قرار دے رہا ہے اور دوسرا پہلے کی بات ردّ کرنے کے لیے تاریخ و تراجم کی کتاب "روضات الجنات" کا حوالہ دے رہا ہے۔ ایک کہتا ہے، اسفار، سفر نامہ ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ اسفار "سِفر" کی جمع اور "کتاب" کے معنوں میں ہے۔ اگر ان دونوں نے خود سے اسفار کے پہلے ورق کا مطالعہ کر لیا ہوتا تو انہیں معلوم ہوتا کہ اسفار، نہ "سِفر" کی جمع ہے اور نہ ہی سفر نامہ ہے۔ اور جہاں تک Kont Gobineau کے اُس استاد کا تعلق ہے جس کی براؤن بات کرتا ہے، تو وہ ظاہراً "ملّا لالہ زار" نامی ایک یہودی ہے کہ جس نے ڈیکارٹ کے رسالہ "گفتار" کے فارسی ترجمہ میں Gobineau کی مدد کی ہے۔ Gobineau نے اسی کتاب میں ملّا صدرا کے عظیم الشأن استاد، میر محمد باقر داماد کو ایک "جدلی" (Dialectician) دانش مند قرار دیا ہے۔ وہ اس امر کی طرف اشارہ کرنے کے بعد

کہ ملّا صدرا شیخ بہائی کی رہنمائی پر میر داماد کے درس میں حاضر ہوئے، ملّا صدرا کی میر داماد کے ہاں تحصیلات کے نتیجہ کے بارے میں لکھتا ہے: اور وہ چند سال بعد فصاحت و بلاغت کے اس مقام پر پہنچا جو ہم پر عیاں ہے۔"[9]

7. مستشرقین کا بھروسہ نہیں

مستشرقین کی چند فاحش غلطیوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد استاد مطہری انہیں اسلامی علوم اور تعلیمات کے تعارف میں ناقابل اعتماد قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ: "وہ لوگ جو مستشرقین کے کارناموں پر کامل یقین رکھتے ہیں، ہم اُن کے لیے یہاں چند نمونے بیان کیے دیتے ہیں۔ یہی Kont Gobineau جو ناصر الدین شاہ کے زمانے میں ایران میں مقیم رہا ہے اور فارسی بولنے کی بھی خوب مہارت رکھتا تھا، اپنی اُس کتاب میں جو اس نے "ایران میں تین سال" کے عنوان سے شائع کی اور یہ کتاب فارسی میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے، جب ایرانیوں کی احوال پرسی کی کیفیت کی توضیح دینے لگتا ہے تو لکھتا ہے:

"جب آپ، صاحب خانہ اور دیگر سب حاضرین بیٹھ جاتے ہیں تو آپ صاحب خانہ کا رخ کرتے اور پوچھتے ہیں کہ آیا آپ کی ناک موٹی ہے؟ صاحب خانہ جواب دیتا ہے: خداوند تعالیٰ کی عنایت کے سہارے میری ناک موٹی ہے، آپ کی ناک کیسی ہے؟.... یہاں تک کہ میں نے بعض مجالس میں دیکھا کہ ایک شخص سے یہ بات پانچ بار پوچھی گئی اور اس نے ہر بار یہی جواب دیا۔ یہاں تک کہ میں نے سنا ہے کہ... ایک تہرانی عالم کی توصیف میں بتا رہے تھے کہ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جب کسی بزرگ کی ملاقات کے لیے جاتے تو نہ فقط اس کی اپنی ناک اور اُس کے عزیزوں کی ناک کے بارے میں، بلکہ ان کے تمام نوکروں اور درباریوں کی ناک کے بارے میں بھی احوال پرسی کرتے تھے۔"[10]

ملاحظہ فرمایئے! یہ شخص چونکہ فارسی زبان کی اصطلاحات سے مکمل آشنائی نہیں رکھتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ "دماغ شما چاق است؟" کے جملہ میں "دماغ" کا کلمہ، ناک کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، لہٰذا اس نے ایرانیوں کی احوال پرسی کی کیفیت یوں تمسخر آمیز طریقے سے نقل کی ہے۔ یقیناً Kont Gobineau نے یہ جملہ نقل کرتے ہوئے بدخواہی نہیں کی، لیکن فارسی زبان سے اس کی ادھوری آگاہی، اس کی اس غلطی کا سبب بنی ہے۔ اب اگر روز مرّہ کی عادات اور رسم ورواج کے تعارف میں ایسی غلطی سرزد ہو سکتی ہے تو فلسفی افکار کی ترجمانی میں کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ خود ایران میں جہاں ابو علی سینا اور ملّا صدرا جیسے دانش مندوں نے پرورش پائی، ہر زمانے میں فضلا کی ایک کثیر تعداد اس امر کی خواہاں رہی ہے کہ ان دانش مندوں کے افکار سے کامل آگاہی حاصل کر پائیں اور انہوں نے اس کام کے لیے اپنی عمر کے کئی سال بھی صرف کئے لیکن آخر پر فقط چند افراد ہی ایسے نکلے جو ان دانش مندوں کے افکار کے سمندر کی تہہ تک پہنچ پائے اور ان افراد کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں سے بھی تجاوز نہیں کرتی۔ بنابریں، ہم کیسے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ دس صدیاں پہلے کا اسلامی فلسفہ اور مثال کے طور پر ابن سینا کے وہ افکار کہ جنہیں فقط ان کے اپنے شاگرد ہی سمجھ پاتے تھے، آیا اِن تراجم میں ٹھیک ٹھیک منعکس ہو پائے ہیں؟

8. اسلامی فلسفہ کا تعارف، ہماری ذمہ داری

"اصول فلسفہ و روش رئالیسم" کی پہلی جلد کے مقدمہ میں استاد مرتضی مطہری آخری اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ خود مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اہل دنیا کو اسلامی فلسفے کا تعارف کروائیں۔ چنانچہ آپ رقمطراز ہیں:

> "ہمارا ہدف مستشرقین کی روش پر تنقید نہیں ہے؛ کیونکہ ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ آئیں اور ہماری ادبیات، تاریخ، مذہب یا فلسفے اور علوم کی تشریح کریں اور اُسے اہل دنیا کے سامنے پیش کریں، از خود ایک بے جا توقّع ہے۔ عربی زبان کی ایک معروف ضرب المثل ہے کہ: "ما حکّ ظهری مثل ظفری" یعنی: "خود میرے ناخن کی مانند کوئی چیز میری پشت کو نہیں کھجلاتی۔"[11]

اگر واقعاً کچھ لوگ یہ چاہتے ہوں کہ اپنا تعارف کروائیں اور اپنی تاریخ یا ادبیات یا مذہب یا فلسفہ اہل دنیا کے سامنے پیش کریں تو اس کا تنہا راستہ یہ ہے کہ وہ یہ کام خود انجام دیں۔ اگر دیگر اقوام کے افراد بالفرض مکمل بے غرضی اور کمال اشتیاق سے یہ بھی کام انجام دینا چاہیں تو بالآخر بعض مقامات پر مکمل آگاہی نہ ہونے کے سبب ان سے بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہوں گی۔ جیسا کہ تاریخ کے بیان یا اقوم کی عادات اور ان کی روز مرّہ کی رسوم و رواج کے تعارف میں ایسے سینکڑوں اشتباہات سرزد ہوئے بھی ہیں۔ اور جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے جو ایک خاص فنی مہارت بھی مانگتا ہے اور جس کے لیے فقط کسی زبان سے آشنائی اور چند کتابیں دیکھ لینا کافی نہیں ہے تو اس کا معاملہ اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

9. اسلامی فلسفہ کی یورپی فلسفہ پر برتری

استاد مرتضی مطہری نے "اصول فلسفہ و روش رئالیسم" کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اسلامی فلسفہ کی یورپی فلسفہ پر

برتری بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گیارہویں صدی ہجری (بمطابق سولہویں صدی عیسوی) میں جب ملّا صدرا ایران میں فلسفے کو اُلٹ پلٹ کر اس کی نئی عمارت کھڑی کر رہے تھے، عین اسی وقت یورپ میں بھی وہ عظیم علمی فلسفی تحریک وجود میں آئی جس کے مقدمات چند صدیاں پہلے سے فراہم ہو چکے تھے۔ اور عین اسی زمانے میں کہ جب ملّا صدرا، قم کے پہاڑوں میں گوشہ نشینی کی زندگی گذارتے ہوئے فلسفی تأملات میں مشغول تھے، تاکہ اپنے افکار کو بہتر طریقے سے رشتۂ تحریر میں لا سکیں، یورپ میں فرانسیسی فلاسفر، ڈیکارٹ نے نیا راگ الاپا۔ اس نے قدماء کی تقلید کا پھندا اپنے گلے سے اتار پھینکا، ایک نئی ڈگر پر چلا اور کئی سال تک ہالینڈ کے ایک کونے میں گوشہ نشینی اختیار کی اور روز مرہ زندگی کے کاموں سے ہاتھ اٹھا کر اپنی عمر کو علمی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔

ڈیکارٹ کے بعد یورپ بو کھلا دینے والی تیزی کے ساتھ علمی انکشافات میں کامیاب ہوا۔ تمام علمی میدانوں میں تحقیق کا اسلوب بدل گیا اور نئے مسائل کھل کر سامنے آئے۔ نیچرل سائنسز اور ریاضی میں شہرت پانے والے دانش مندوں کے علاوہ فلسفے کے میدان میں بھی یکے بعد دیگرے عظیم فلاسفر زرونما ہوئے جنہوں نے فلسفے کو نئی وادیوں میں اتارا۔

یورپ کے اس جدید فلسفہ میں قرون وسطی کے قدیم فلسفی مسائل پر کمتر توجہ دی گئی اور اس کی جگہ چند جدید مسائل نے لے لی جو قدماً کی توجہ جذب نہ کر پائے تھے۔ یورپ میں ڈیکارٹ سے لے کر اب تک کئی فلسفی مکاتب وجود میں آئے اور کچھ لوگ ہر مکتب کے پیروکار بھی رہے۔ کچھ لوگوں نے Rational Philosophy کی پیروی کی تو کچھ نے فلسفی مسائل کو بھی سائنسی علوم کے دریچے سے دیکھا۔ بعض نے فلسفۂ اولیٰ اور حکمتِ الٰہی کو قابل بحث و تحقیق جانا اور اس باب میں آرأ و نظریات پیش کیے، جبکہ بعض نے یہ دعوی کیا کہ انسان سرے سے ان مسائل کو درک کرنے سے عاجز ہے اور اس باب میں نفی یا اثبات میں جو کچھ کہا گیا ہے، سب بے دلیل ہے۔ کچھ لوگ اپنے عقائد میں الٰہی بن گئے تو کچھ مادی۔

یورپ میں فنِ فلسفہ کی قابل غور پیشرفت نہ ہونے کے حوالے سے استاد مطہری لکھتے ہیں کہ:

> "کلی طور پر اُس فن میں کہ جو قدیم الایام سے "فلسفۂ حقیقی" یا "علم اعلیٰ" کے نام سے معروف ہے، یعنی وہ فن جس میں عالم ہستی کے کلی نظام میں تحقیق اور عالمِ وجود کے آغاز و انجام کی توضیح بیان کی جاتی ہے، اِس فن میں یورپ میں، خواہ قرون وسطی میں خواہ جدید دور میں، کوئی قابل ملاحظہ پیشرفت نہیں ہوئی اور نہ ہی کوئی ایسا مضبوط اور قانع کنندہ نظام سامنے آ سکا جو فلسفے کو انتشار سے نجات دلاتا۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ میں ضد و نقیض فلسفی مکتب سامنے آئے۔ ہاں! یورپ میں ہونے والی تحقیقات میں سے جو کچھ اب بھی مطالعہ کے قابل اور تحسین و تمجید کے لائق ہے

اور فلسفے کے نام پر شہرت پا گیا ہے، در حقیقت، وہ فلسفہ نہیں، بلکہ ریاضیات، فزکس یا نفسیات سے مربوط مسائل ہیں۔"[12]

بنابریں، استاد مرتضی مطہری کے نکتہ نظر سے حق و انصاف کی بات تو یہ ہے کہ فلسفے کے میدان میں مسلمان فلاسفرز نے تحقیق پر زیادہ وقت صرف کیا ہے اور اِس کام کو بخوبی انجام دیا ہے۔ انہوں نے یونان کے ادھورے فلسفے کو بھی کافی آگے بڑھایا اور جب یونانی فلسفے نے عالم اسلام میں قدم رکھا تو اُس کے پاس دو سو سے زائد فلسفی مسائل نہ تھے، لیکن عالم اسلام میں آکر اسی فلسفے کے مسائل کی تعداد سات سو سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ، بنیادی ترین مسائل میں بھی استدلال کے اسلوب یونانی روش سے ہٹ چکے ہیں اور اب تو فلسفی مسائل نے ریاضی کے مسائل کا رنگ اپنا لیا ہے۔ صدر المتألہین کے فلسفہ میں یہ خصوصیت تقریبا قابل مشاہدہ ہے اور یہ حق بات برملا کہنا چاہیے کہ اس وادی میں مسلمان فلاسفرز، دیگر دانش مندوں سے بہت آگے ہیں۔

یہ وہ مطالب ہیں جو اس کتاب کے مقالات کے اُس سلسلہ میں جو پیش کیا جا رہا ہے، اپنے دلائل و شواہد کے ساتھ قاری پر واضح ہو جائیں گے۔

*****

References

1. Allama Syed Muhammad Hussain Tabatabaie, *Usool-e Falsafa wa Rawish-e Realism*, Vol. 1 (Tehran, *Intesharat-e Sadra*, 1393 SH.), 10.

علامہ سید محمد حسین، طباطبائی، *اصول فلسفہ وروش رئالیسم*، جلد 1 (تہران، انتشارات صدرا، 1393ہ، ش)، 10۔

2. Ibid.

ایضاً۔

3. Ibid.

ایضاً۔

4. Ibid, 12.

ایضاً، 12۔

5. Ibid.

ایضاً۔

6. Ibid, 13.

ایضاً،13۔

7. Ibid, 14.

ایضاً،14۔

8. Ibid.

ایضاً۔

9. Ibid, 14-15.

ایضاً،14،15۔

10. Ibid, 16.

ایضاً،16۔

11. Ibid, 15.

ایضاً،15۔

12. Ibid, 17-18.

ایضاً، 17،18۔